© rasailojaraid.com

مندرجہ بالا سطور سے یہ ثابت ہوجاتا ہے کہ شاہ ولی اللہ، شاہ عبدالعزیز، شاہ رفیع الدین سے متعلق یہ واقعات محض افسانے اور من گھڑت قصے ہیں جن کی کوئی تاریخی حیثیت نہیں، اس میں شبہ نہیں کہ اس زمانے میں شیعہ سنی اختلاف کافی بڑھا ہوا تھا۔ اور شاہ ولی اللہ کی ازالۃ الخفاء اور شاہ عبدالعزیز کی تحفہ اثنا عشریہ اسی دورِ اختلاف کی یادگار ہیں، یہ بات بھی یقینی ہے کہ شیعہ حضرات ان کے کافی خلاف ہوگئے تھے، مگر مخالفت میں اس طرح کے غیر مؤثر مظالم جیسا کہ ہم نے دیکھا ناممکن تھے، ہاں البتہ انھوں نے مخالفت میں ان علمی تصانیف کا جواب تصانیف سے دیا اور واقعتاً صرف تحفۂ اثنا عشریہ کی تردید میں سولہ[16] کتابیں لکھی گئیں، اور یہی بات قیاس سے زیادہ قریب بھی معلوم ہوتی ہے، یہ ممکن ہے کہ بعض بیہودہ قسم کے مخالفین نے ان کو تنگ کیا ہو جیسا کہ خود اُن کے ملفوظات سے بھی ظاہر ہے، مگر خاں صاحب کے بیانات قیاس اور تاریخ دونوں کے منافی ہیں۔

تعجب ہے، امیر شاہ خاں صاحب کی اس روایت کو ضرورت سے زیادہ کیوں اہمیت دیدی گئی ہے۔ اور اس سے بڑھ کر تعجب اس بات پر ہے کہ مولانا اشرف علی صاحب نے اس پر حاشیہ کیسے لکھ دیا، اس لئے کہ خاں صاحب موصوف باوجود اپنی بزرگی کے علمی آدمی نہ تھے، وہ صرف مولانا رشید احمد گنگوہی اور مولانا قاسم نانوتوی رحمہما اللہ اور اس دور کے دوسرے بزرگوں کی صحبت میں رہے، انھوں نے لوگوں کی زبانی جو واقعات سُنے تھے انھیں کو بیان کیا کرتے تھے، امیر الروایات ان کی کوئی مستقل تصنیف بھی نہیں ہے، بلکہ ان کے ملفوظات کا مجموعہ ہے اور جس میں غلطی کا پورا پورا احتمال ہے۔

اصل میں مولانا مناظر احسن گیلانی امیر شاہ خاں صاحب سے کافی عقیدت رکھتے تھے اس لئے انھوں نے جو کچھ بھی خاں صاحب سے سُنا بلا کسی جرح و تنقید کے اس پر ایمان لے آئے اور اپنے زورِ قلم سے رائی کا پربت اس طرح بنایا کہ دوسرے جذباتی قسم کے حضرات بھی اس کو سچ سمجھ بیٹھے، لیکن تاریخ تاریخ ہے اور افسانہ افسانہ! دونوں کبھی ایک نہیں ہوسکتے۔

عرب اور اسلام
پروفیسر ہِتی کی شہرۂ آفاق کتاب کے معروف خلاصے کا ترجمہ
مترجمہ: پروفیسر مبارز الدین رفعت
ص ۲۵۰، قیمت -/۴، مجلد -/۵، ملنے کا پتہ: مکتبہ بُرہان، اردو بازار جامع مسجد دہلی ۶

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

دیارِ غرب کے مشاہدات و تاثرات

(۸)

سعید احمد اکبر آبادی

یونیورسٹی میں ایک تقریب انسٹیٹوٹ کے ساتھ تعلق کی تقریب سے میں مکگل یونیورسٹی کے تعلیمی اسٹاف میں شامل تھا اس لئے یونیورسٹی کی متعدد چھوٹی بڑی تقریبات میں شریک ہونے کا موقع ملا، ہر ایک کا بیان کرنا تو غیر ضروری بھی ہے اور لاطائل بھی، صرف ایک اہم تقریب کا حال سُن لیجیے، ہمارے ہاں ایک وائس چانسلر جاتا اور اُس کی جگہ دوسرا آتا ہے، تو پوری کارروائی چارج لینے اور دینے کی صرف دفتری ہوتی ہے۔ باقاعدہ کوئی رسم ادا نہیں ہوتی، لیکن وہاں ایسا نہیں ہے، چنانچہ ۲ اپریل ۶۳ء کو شام کے چار بجے یونیورسٹی کے عظیم الشان اسمبلی ہال میں یہ رسم منائی گئی، اس کی شکل کنووکیشن کی سی ہوتی ہے لیکن فرق صرف یہ ہے کہ اس میں صرف اساتذہ اور حکام یونیورسٹی شریک ہوتے ہیں، طلباء کو اجازت نہیں ہوتی، پروگرام کے مطابق میں ۳½ بجے ہال کے قریب میں ایک مقررہ جگہ پر پہونچا تو دیکھا کہ سیکڑوں مردوں اور عورتوں کا ایک اچھا خاصہ میلہ تھا۔ ہر ایک اپنا نمبر لے کر ایک کونٹر پر جاتا تھا اور وہاں کونٹر کی لڑکی اسے گاؤن (GOWN) اور ھُڈ (HOOD) دے دیتی تھی، میں نے بھی ایسا ہی کیا اور یونیورسٹی کا علمی لباس پہن کر میرے لئے یونیورسٹی کے سینیر اساتذہ کی جو صف مقرر کر دی گئی تھی اُس میں آکر کھڑا ہو گیا۔

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

چار بجنے میں پانچ منٹ باقی تھے کہ ایک اشارہ ہوا اور انسانوں کا یہ سیلِ رواں جلوس کی شکل میں قدم سے قدم ملائے اور آنکھیں جھکائے روانہ ہوگیا، اور چند منٹ میں اسمبلی ہال میں داخل ہوکر ہر شخص اپنی اپنی جگہ پر خاموشی سے بیٹھ گیا۔ ڈائس پر بحیثیتِ صدر کے گورنر جنرل جو برطانوی حکومت کے نمائندہ کی حیثیت سے یہاں رہتے اور اپنے عہدہ کے اعتبار سے یونیورسٹی کے چانسلر ہوتے ہیں بیٹھے تھے اور ان کے اردگرد رونده اور آئنده دونوں وائس چانسلر، رجسٹرار اور ٹریژرر اور ڈین تھے، ڈائس پر ہی بشپ تشریف فرما تھے اور ان کی کرسی گورنر جنرل کی کرسی سے متصل تھی، تقریب کا آغاز و اختتام دونوں بائبل کی تلاوت سے ہوئے، آغاز میں جو دعا پڑھی گئی وہ بڑی مؤثر تھی، اس کے بعد ایک مختصر تقریر ہوئی جس میں جانے والے وائس چانسلر کی خدمات کا اعتراف اور ان کے جانشین کا خیر مقدم کیا گیا تھا، پھر رسمی طور پر سابق وائس چانسلر نے دوسرے کو چابی دی اور جلسہ ختم ہوگیا، پوری تقریب میں چالیس پینتالیس منٹ سے زیادہ نہیں لگے۔

انسٹیٹوٹ کی سوشل زندگی انسٹیٹوٹ کی تعلیمی زندگی کے متعلق تو آپ نے بہت کچھ سن لیا، اب اس کی سوشل لائف کا حال بھی سنتے چلیے:-

مجھ کو امریکہ اور یورپ میں بارہا یہ محسوس ہوا ہے کہ ان ملکوں میں مذہب اصل شکل و صورت میں قائم ہو یا نہ ہو، یہاں عیسائیت زندہ ہو یا مردہ، بہر حال حضرت عیسیٰؑ کی ایک تعلیم نے ان لوگوں کے دل و دماغ اور مزاج و طبیعت پر غیر معمولی اثر کیا ہے اور وہ تعلیم ہے، "LOVE THY NEIGHBAUR" اپنے پڑوسی سے محبت کرو، دوسرے انسانوں کا خیال، اُن کے ساتھ ہمدردی اور ضرورت کے وقت اُن کی مدد کرنے کا جذبہ اُن لوگوں میں اس کثرت اور شدت سے پایا جاتا ہے کہ گویا وہ ان کا ایک وصفِ امتیازی بن گیا ہے، کناڈا کی پوری مدتِ قیام میں اگر میں نے راہ چلتے کسی سے خواہ مرد ہو یا عورت، جوان ہو یا بوڑھا، یہ پوچھ لیا ہے کہ "مجھے فلاں جگہ جانا ہے میں کیسے جاؤں؟" تو وہ وہیں مجھے لے کر کھڑا ہوگیا ہے، اور ہمدردی

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اور اطمینان سے پوری بات بتائی ہے، اگر پھر بھی اُس کو شبہ ہوا کہ میں کما حقہٗ نہیں سمجھا تو وہ مجھے لے کر ایک بس کے اسٹیشن (کھڑے ہونے کی جگہ) پر آیا اور جب متعلقہ بس آئی تو مجھے اس میں بٹھا کر کنڈکٹر سے کہا کہ مجھے فلاں مقام پر اتار دے اور اُس کے بعد وہ رخصت ہوا ہے، یہ فیلو فیلنگ یہاں کے خمیر میں داخل ہے، یونیورسٹیاں، تعلیم اور کردار سازی کے مرکز ہوتی ہیں، اس لئے یہ جوہر اس ماحول میں اور پروان چڑھتا اور نمایاں ہوتا ہے، چنانچہ انسٹیٹوٹ کی چہار دیواری میں اس کا احساس زیادہ ہوتا تھا، سب لوگ ایک خاندان کے افراد کی طرح رہتے تھے، اُن میں نہ چھوٹے بڑے کی اُونچ نیچ تھی، اور نہ اختلافِ مذہب یا اختلافِ رنگ و نسل کی بنیاد پر کسی قسم کی اجنبیت کا احساس!

آزادیِ رائے کا احترام اور وسیع المشربی کا یہ عالم کہ کناڈا کی ایک لڑکی نے جو انسٹیٹوٹ میں ملازم تھی اسلام قبول کر کے یہیں کے ایک ملایا کے مسلمان طالبِ علم سے نکاح کر لیا تو کسی کے ماتھے پر شکن بھی نہیں پڑی اور ان دونوں کے ساتھ انسٹیٹوٹ کا جو رویہ پہلے سے تھا اُس میں ذرا فرق نہیں آیا- خواجہ محمد شفیع نے مجھے خود سُنایا کہ جب وہ شروع شروع میں مونٹریل آئے ہیں تو چونکہ انہیں کوئی کمرہ کرایہ پر لے کر رہنا تھا اس لئے عارضی طور پر انہیں ایک پادری صاحب کے مکان پر ضیفِ معطی (PAYING GUEST) کی حیثیت سے ٹھہرا دیا گیا، اب پہلے ہی وقت کھانا میز پر آیا اور خواجہ صاحب نے معذرت کرتے ہوئے کہا کہ گوشت وہ صرف کوشر (ذبیحۂ یہود) کھا سکتے ہیں، تو میزبان پادری نے اس کا اس درجہ خیال کیا کہ ہفتہ بھر تک کے لئے (جب تک خواجہ صاحب اس مکان پر مقیم رہے) خود بھی ترکِ لحم کر دیا اور ترکاریوں پر گذر کیا- ذبیحۂ نصاریٰ خواجہ صاحب نہیں کھا سکتے تھے، اور ذبیحۂ یہود ایک پادری کے گھر میں نہیں آسکتا تھا اس لئے نتیجہ یہ ہوا کہ آٹھ روز تک کھانے کی میز پر گوشت ہی نہیں آیا- شراب نوشی ان لوگوں کے ہاں عام ہے- یونیورسٹیوں میں اساتذہ بھی پیتے ہیں اور طلبا بھی، لیکن ہمارا انسٹیٹوٹ چونکہ اسلامیات سے تعلق رکھتا تھا، اس لئے شراب کا یہاں گذر نہیں تھا، حالانکہ یہاں روزانہ لنچ کھانے کے علاوہ وقتاً فوقتاً بڑے بڑے شاندار لنچ اور ڈنر بھی ہوتے تھے، اور صرف انسٹیٹوٹ کے حدود میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

نہیں، بلکہ انسٹیٹوٹ کے اساتذہ اور طلباء باہم جو پرائیویٹ دعوتیں اپنے مکانوں پر کرتے تھے، وہاں بھی اس دخترِ رز کی شکل کبھی نظر نہیں آئی، میرے وہاں پہونچنے سے پہلے کی بات ہے۔ ایک مرتبہ انسٹیٹوٹ کے ایک امریکن ممبر اسٹاف کے گھر میں لڑکا پیدا ہوا تو انھوں نے اس خوشی میں چند دوستوں کو انسٹیٹوٹ میں ہی دعوت دی اور بیئر بھی منگوائی، اس پر کوئی شخص بول اٹھا، کہ اگر پروفیسر اسمتھ کو اس کی خبر ہوگئی تو بہت ناراض ہوں گے، معزز میزبان جو انسٹیٹوٹ میں نووارد تھے انھوں نے یہ سنا تو فوراً سب بوتلیں نالی میں بہادیں، شراب کی طرح لحمِ خنزیر کا بھی یہاں گذر نہیں ہوسکتا تھا۔

کرسمس اور پھر سالِ نو کے دن عیسائی دنیا میں بڑی دھوم دھام اور فرطِ نشاط و انبساط کے ساتھ منائے جاتے ہیں، ان دنوں میں ثقہ بھی غیر ثقہ ہوجاتے ہیں اور بوڑھے بھی جوانوں کی طرح اچھل کود کرنے میں کوئی مضائقہ نہیں دیکھتے "عشق سعدی تا بزانو" سہی۔

شب کے وقت جو پارٹیاں ہوتی ہیں اُن میں حوصلۂ ظرف سے زیادہ شراب نوشی اور پھر ڈانس یہ دونوں تو لازمی چیزیں ہیں، چنانچہ میں جس ہوٹل میں رہتا تھا، اُس کے پروپرائٹر کی طرف سے ۱۵ر دسمبر سنہ ۶۲ء کی شب میں ایک "سالانہ" کرسمس پارٹی ہوئی، اس میں یہی کچھ ہوا، پھر اس طرح کی پارٹیاں سوسائٹی کے کسی ایک طبقہ کے ساتھ مخصوص نہیں ہیں۔ یونیورسٹیوں کے احاطوں میں بھی ہوتی ہیں۔ انسان کی فطرت بھی عجیب ہے، اچھے سے اچھے کام کو نیک مقصد و ارادہ سے شروع کرتا ہے مگر وقت گذرنے کے ساتھ اُس میں تبدیلی پیدا ہوتی رہتی ہے۔ اور آخر جو کام سرتاسر اجر و ثواب تھا وہ سرمایۂ گناہ و معصیت بن جاتا ہے، یہ صرف عیسائیوں کے ساتھ مخصوص نہیں، ہر مذہب کے لوگ اس میں مبتلا ہیں، بزرگانِ دین کے مزارات پر عرس اور عید کے میلے ٹھیلے ہوتے ہیں۔ ہولی پر رنگ ریزی اور گلال پاشی ہوتی ہے۔ اُن میں کون نہیں جانتا کہ نظر کے ساتھ کتنے دل بھی پھسل جاتے ہیں، اور "جو گنہ کیجئے ثواب ہے آج" کہہ کر اپنی تسلی کر لیتے ہیں۔

لیکن ہمارے انسٹیٹوٹ نے اس تقریب کے موقع پر بھی اپنی روایات کو قائم رکھا۔ چنانچہ سابق برسوں کی طرح امسال بھی ۱۲ر دسمبر کو پروفیسر اور مسز اسمتھ کی طرف سے انسٹیٹوٹ کے تمام

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

لوگوں کی مع اُن کے جملہ متعلقین کے ایک نہایت عظیم الشان پارٹی خاص انسٹیٹوٹ کی بلڈنگ میں ہوئی کھانے ایک سے ایک بڑھ کر اور اس قدر متنوع کہ خوب شکم سیر ہو کر کھانے کے باوجود متعدد قابوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا جا سکا۔ اسمتھ صاحب، ان کی بیگم اور ان کے لڑکے اور لڑکیاں ہمارے ہاں کے نوکروں اور خانساماؤں کی طرح ہنستے مسکراتے، مہمانوں کی خاطر تواضع کرتے پھر رہے تھے، یہاں کھانے کے ساتھ پانی تو شاذونادر ہی پیتے ہیں، ورنہ عام طور پر پھلوں کا عرق یا کافی یا چاء استعمال کرتے ہیں۔ اسمتھ صاحب نے اس موقع پر مختلف پھلوں کے عرق کا انتظام کیا تھا۔ عرق بھی کیسا؟ بالکل تازہ۔ شہد وانگبین کی طرح میٹھا، نسیمِ سحر کی مانند لطیف و شفاف، اور برف کی طرح خنک، جو لوگ اس کا ذوق نہیں رکھتے تھے اُن کے لئے کافی بھی تھی۔ کھانے کے بعد (یا شاید کھانے سے پہلے! اب ٹھیک یاد نہیں رہا) متعدد قسم کے کھیل ہوئے تو اُن میں بھی انسٹیٹوٹ کی شان جھلکتی تھی، مثلاً: اسمتھ صاحب نے کہا "جنوب مشرقی ایشیا کے کسی دو ایسے اسلامی ملکوں کے نام ایک پرچہ پر لکھئے جن کے شروع میں " ق " آتا ہے"، یا "اٹھارھویں صدی کے دو ایسے مسلمان مصنفین کا نام لکھئے، جنھوں نے اپنے قلم سے تلوار کا کام لیا ہے اور اُن کے نام کا پہلا حرف میم ہے"، وغیرہ وغیرہ، غرض کہ یہ سب کھیل کود جو ۴۵ منٹ کے تھے، اسی قسم کے تھے، ان میں مقابلہ ہوتا تھا، اور ناموں کے اعلان کے بعد جب انعام ملتا تھا تو قہقہہ لگتا تھا۔ اس کے بعد ہر ملک کے آدمی نے اپنی اپنی زبان کی کوئی نظم یا غزل سنائی۔ اُردو غزل ایک صاحب سنا چکے تھے، اس لئے جب مجھ سے فرمائش کی گئی تو میں نے متنبی کے ایک قصیدہ کے دس بارہ تشبیب کے اشعار عربی لہجہ میں گا کر سنائے، پھر انعامات اور تحفے تحائف تقسیم ہوئے اور آخر میں بائبل کی ایک دعا سب نے مل کر گائی اور تقریباً بارہ بجے یہ مجلس برخاست ہو گئی۔ اس میں بھی نہ کہیں شراب تھی، اور نہ رقص نہ فحش مذاق اور نہ کوئی اخلاق سے گری ہوئی حرکت، قہقہے تھے مگر پارسایانہ، مذاق اور چبھتے ہوئے فقرے تھے لیکن دامن بچائے ہوئے۔

یہ ظاہر ہے کہ وہاں کا معیارِ زندگی ہمارے مقابلہ میں بہت اونچا ہے اور اسی تناسب سے

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اشیاء کا نرخ اور ان کی قیمتیں بھی ہیں، بس یوں سمجھئے کہ قوتِ خرید کے اعتبار سے وہاں کا ڈالر اور ہمارا روپیہ دونوں برابر ہیں، ایسے ماحول میں کسی کم آمدنی رکھنے والے پر اچانک کوئی غیر معمولی خرچ آپڑے تو اس کا پریشان ہونا لازمی ہے، لیکن وہاں متعدد قسم کے خیراتی اور رفاہِ عام کے ادارے ہیں جو اس طرح کے مواقع پر ضرورت مند اصحاب کی امداد و اعانت کرتے ہیں، اور اس معاملہ میں ملکی اور غیر ملکی اور ہم مذہب ہونے نہ ہونے کا فرق و امتیاز نہیں کرتے، میرے ایک پاکستانی دوست جو انسٹیٹیوٹ میں میری طرح ایک سال کے لیے آئے تھے وہ یہاں ستمبر میں پہنچے، اور ایک ماہ کے بعد ہی یعنی اکتوبر میں انہیں یہ حادثہ پیش آگیا کہ ایک دن شب میں نو دس بجے کے درمیان کھانا کھا کر وہ چہل قدمی کے لیے نکلے، ابھی تھوڑی دور گئے تھے کہ اچانک پاؤں پھسلا اور وہ لڑکھڑا کر جو گرے تو پاؤں کی ہڈی تڑخ کر ٹوٹ گئی، اُن کے پاس سے جو شخص گزر رہا تھا اس نے فوراً مونٹریل رائل ہسپتال کو فون کر دیا اور منٹوں میں ہسپتال کی ایمبولنس کار آکر اُن کو لے گئی اور ایمرجنسی وارڈ میں داخل کر دیا۔ یہاں ان کی مرہم پٹی ہوئی اور پھر انہیں جنرل وارڈ میں داخل کر دیا گیا، وہاں جنرل وارڈ میں ہی مریض کے لیے ہر قسم کی سہولتیں اور راحت و آرام کی تمام آسانیاں مہیا ہوتی ہیں، اس لیے پرائیویٹ وارڈ کی ضرورت نہیں ہوتی، اسی وارڈ میں یہ ڈیڑھ دو مہینے رہے ہوں گے مگر اب شفاخانہ کی طرف سے ان کے نام بِل آیا تو وہ آٹھ سو ڈالر کا تھا، ظاہر ہے اس سے ان کو جتنی بھی پریشانی ہوتی کم تھی، لیکن اسمتھ صاحب کو اس کا علم ہوا تو انھوں نے تسلی دی اور کہا کہ آپ گھبرائیں نہیں، میں اس کا انتظام کر دوں گا، چنانچہ انھوں نے یونیورسٹی کو ایک خط لکھ دیا، اور یونیورسٹی نے فوراً آٹھ سو ڈالر کا ایک چک اُن صاحب کے نام بھیج دیا، معلوم ہوا کہ کسی شخص نے لاکھوں روپیہ کا ایک فنڈ یونیورسٹی کو خاص اس مقصد کے لیے ہی دیا ہے کہ یونیورسٹی کا کوئی ملازم بیمار ہو جائے اور اس کو اپنی آمدنی اور حیثیت سے زیادہ علاج پر خرچ کرنا پڑے تو اس فنڈ سے اُس کی مدد کی جائے، چنانچہ یہ امداد اسی فنڈ سے کی گئی تھی۔

ہماری یونیورسٹیوں میں رخصت بوجہ علالت (MEDICAL LEAVE) کے جو

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

قواعد وضوابط عام طور پر رائج ہیں، اُن میں مدتِ ملازمت کے تناسب سے رخصت کے دن متعین ہوتے ہیں، اور بعض خاص صورتوں کو مستثنیٰ کر کے تنخواہ پوری نہیں بلکہ نصف ملتی ہے لیکن یہاں تنخواہ بھی پوری ملی اور اُوپر سے ایک وقیع امداد بھی ہوگئی، مجھے جب یہ معلوم ہوا کہ یہاں علاج اس درجہ گراں ہے تو سخت پریشانی ہوئی، اسمتھ صاحب سے اس کا تذکرہ آیا تو انھوں نے مشورہ دیا کہ میں تندرستی کا بیمہ کرالوں، چنانچہ میں نے بیمہ کرالیا، اس طرح مجھ کو اپنی تنخواہ کا ڈیڑھ فی صد ماہانہ دینا پڑتا تھا۔ اگرچہ اللہ کا ہزار ہزار شکر ہے اس بیمہ سے فائدہ اٹھانے کی نوبت نہیں آئی لیکن یہ اطمینان ہوگیا کہ جب کبھی میں بیمار ہوں گا تو خواہ کوئی بیماری ہو اور علاج کتنے ہی دن چلے، بہرحال دوا دارو، ڈاکٹر کا معائنہ، شفاخانہ کی سہولتیں، نرسنگ وغیرہ جو اعلیٰ سے اعلیٰ پیمانہ پر ہوں گی وہ سب مفت ہوں گی، یہ نفسِ احساس بہت کچھ تقویتِ دل اور جمعیتِ خاطر کا باعث تھا۔

اسی طرح کی چیزیں ہیں جن کی وجہ سے وہاں معیارِ زندگی کے بہت زیادہ اونچا ہونے کے باوجود لوگوں میں وہ انتشارِ ذہنی، بددلی اور اندرونی الجھن نہیں پائی جاتی، جو ایشیا کے ملکوں میں عام طور پر محسوس کی جاتی ہے، وہاں اگر آپ بے روزگار ہیں تو جب تک روزگار نہیں ملے گا، حکومت کی طرف سے آپ کو بے روزگاری کا الاؤنس ملتا رہے گا۔ اگر آپ بوڑھے ہوگئے ہیں اور کسبِ معاش کے لائق نہیں رہے ہیں تو آپ اپنے بیٹے بیٹی یا کسی عزیز قریب پر بوجھ نہیں ہونگے حکومت کی طرف سے بوڑھے مردوں اور عورتوں کے لئے ہر جگہ گھر (HOME) بنے ہوئے ہیں۔ وہاں جاکر داخل ہوجائیے، اس گھر میں آپ کو غذا، لباس، سیر و تفریح، خانہ داری کا سازوسامان وہ سب کچھ ملے گا جو اس عمر میں آپ کو صحت مند اور خوش رکھنے کے لئے ضروری ہے۔

آمدنی پر ٹیکس ہر حکومت لیتی ہے اور اُسے لینا چاہیئے، لیکن ہمارے ہاں قاعدہ یہ ہے کہ اگر بالفرض آپ کی آمدنی پانچسو روپیہ ماہوار ہے۔ تو شرح ٹیکس کے حساب سے اس آمدنی پر ٹیکس کی جو رقم آپ کے ذمہ نکلتی ہے، وہ بہرحال آپ کو ادا کرنی ہوگی، خواہ آپ مجرد ہوں، یا شادی شدہ اور دوسری صورت میں آپ لاولد ہوں یا تین چار بچوں کے باپ، غرض کہ ٹیکس

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

کی رقم مقرر کرنے میں صاحبِ آمدنی کے اخراجات کا قطعاً کوئی لحاظ نہیں کیا جاتا۔ بعض صورتوں میں شادی شدہ اور غیر شادی شدہ میں فرق ضرور ہوتا ہے، لیکن تمام واجبی اور لازمی اخراجات کی رعایت نہیں کی جاتی، لیکن وہاں یہ بات نہیں ہے، چنانچہ جب میں ستمبر میں مونٹریل پہونچا اور جاتے ہی مجھے اگست کی تنخواہ کا چک ملا تو میں نے دیکھا کہ اُس میں بارہ فی صدی رقم انکم ٹیکس میں وضع کرلی گئی تھی، مجھے اس سے تکلیف تو ہوئی مگر کرتا کیا؟ چپ ہوگیا، دوسرے دن میں انسٹیٹوٹ پہونچا تو ڈاکٹر چارلس آڈم مجھے اپنے کمرہ میں لے گئے اور ایک فارم دیا جس کی میں نے خانہ پُری کی، اس میں مجھے بتانا پڑا کہ میرے ذمہ کن کن لوگوں کے اخراجات ہیں، بیوی کے علاوہ کتنے بچے اور بچیاں ہیں، اُن کی عمر کیا ہے، وہ کسی اسکول یا کالج میں زیرِ تعلیم ہیں یا نہیں؟
اس طرح میں نے اپنے گھر کے تمام افراد کی فہرست لکھ دی اور اب آڈم صاحب نے حساب لگایا تو انکم ٹیکس بہت تھوڑا رہ گیا، اور جو رقم پہلے میری تنخواہ میں سے وضع کرلی گئی تھی وہ واپس مل گئی، اب ٹھیک یاد نہیں ہے، مگر یہ حساب کچھ اس قسم کا تھا کہ ایک ہزار ڈالر سالانہ خود صاحبِ آمدنی کا خرچ۔ پانچ سو ڈالر بیوی کا، تین تین سو ڈالر فی بچہ، دو سو ڈالر، خوش دامن اور اتنا ہی باورچی کا خرچ، یہ سب ملاکر جتنی رقم ہوئی اُس پر کوئی ٹیکس نہیں ہوگا، میں نے وہاں دیکھا کہ شادی بیاہ نوعمری میں ہی ہوجاتے ہیں۔ یونیورسٹی میں طلباء اور طالبات کی ایک بڑی تعداد آپ کو اُن لوگوں کی ملے گی جو شادی شدہ ہوں گے۔ میں نے اس کی وجہ پوچھی تو معلوم ہوا کہ لڑکا لڑکی دونوں کو وظیفہ ملتا ہے اس لئے کوئی کسی پر بار نہیں ہوتا۔ پھر شادی کا فائدہ یہ ہوتا ہے کہ ٹیکس کم ہوجاتا ہے، ہمارے ہاں جب تک صاحبزادہ کی تعلیم ختم نہیں ہوجاتی اور وہ برسرِ روزگار ہوکر اپنے پاؤں پر کھڑا نہیں ہوجاتا اُس وقت تک نہ اس غریب کو شادی کرنے کی جراءت ہوتی ہے اور نہ اُس کے ماں باپ اس کا خیال کرتے ہیں، اور نہ اس حالت میں کوئی لڑکی والا ہی اپنی بیٹی دینے کی ہمت کرتا ہے، مگر وہاں یہ بات نہیں، اُس کی وجہ یہ ہے کہ یہاں ہر نوجوان جو تعلیم پا رہا ہے اُس کا مستقبل غیر یقینی ہے، اسے نہیں معلوم کہ تعلیم سے فراغت کے بعد اُسے نوکری ملے گی یا نہیں؟ اور اگر ملے گی بھی تو کس درجہ کی؟ لیکن وہاں کسی نوجوان لڑکے یا لڑکی کے ذہن میں

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

اس طرح کے شکوک و شبہات نہیں ہوتے، اُن کے سامنے پہلے سے ایک مقصد اور ایک نصب العین ہوتا ہے اور انہیں یقین ہوتا ہے کہ تعلیم ختم کرنے کے بعد اُس نصب العین کے حاصل کرنے میں اُن کے لئے کوئی مانع اور رکاوٹ نہیں ہے، وہاں ہر نوجوان ہمارے ملک کی طرح سرکاری نوکری کا خواہاں نہیں ہوتا، اُس کے نزدیک کسی عہدہ پر فائز ہونا، یا کوئی کاروبار کرنا، دونوں برابر ہیں، اسے کسی کام میں عار نہیں ہے، وہ سمجھتا ہے کہ ملک میں ہر پیشہ اور ہر صنعت و حرفت کے انسان کی کھپت ہے، اس لئے اپنے ذوق اور رجحان کے مطابق ایک پیشہ کا انتخاب کرتا اور اُس کے مطابق ہی تعلیم حاصل کرتا ہے۔ جو لوگ مذہبی تعلیم کی تکمیل کرتے ہیں، یہ سمجھ کر کرتے ہیں کہ انہیں مذہب کی خدمت کرنی ہے، اس بنا پر اُنکی زندگیاں عام طور پر سادہ اور بے تکلف ہوتی ہیں، وہ اس میں خوش رہتے ہیں، اور زیادہ کی ہوس نہیں کرتے۔

میں نے یونیورسٹی کے بعض اساتذہ سے دریافت کیا کہ کیا طالب علمی کے زمانہ میں شادی کر لینے سے تعلیم میں رخنہ پیدا نہیں ہوتا؟ انھوں نے کہا کہ اگر اقتصادی بوجھ نہ ہو تو شادی سے نہ صرف یہ کہ تعلیم میں رخنہ پیدا نہیں ہوتا بلکہ اُس سے صحت اچھی رہتی ہے۔ خیالات میں یکسوئی پیدا ہو جاتی ہے اور اس بنا پر اس کا تعلیم پر اثر اچھا ہوتا ہے، جو قومیں زندہ اور ترقی یافتہ ہوتی ہیں وہ کس طرح سوچتی ہیں؟ آپ کو اسی سے اندازہ ہو گیا ہوگا، اس سلسلہ میں ایک واقعہ سُن لیجئے، کم از کم مجھے تو اس سے بڑی عبرت ہوئی ہے۔

ہمارے انسٹیٹوٹ میں ایک ہندوستانی نوجوان ایم، اے کلاس میں داخل تھے —— یہ شادی شدہ ہیں اور ماشاءاللہ تین بچوں کے باپ بھی: یہ اُن کا دوسرا سال ایم، اے فائنل کا تھا، اپریل ۶۳ء میں امتحان ہوا، اور یہ اُس میں بہت اچھے نمبروں سے کامیاب ہو گئے، اب اُن کی خواہش ہوئی کہ پی، ایچ، ڈی میں داخلہ لے لیں اور اس طرح دو تین برس اور یہاں قیام کریں، چنانچہ انھوں نے داخلہ کی درخواست دے دی، ۷ رمئی ۶۳ء کو اسٹاف میٹنگ

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ہوئی جس میں میں بھی شریک تھا، داخلہ کی تمام درخواستوں پر اسی میٹنگ میں غور کرنا تھا، جب اس نوجوان کی درخواست زیرِ غور آئی تو پروفیسر اسمتھ نے بحیثیت ڈائرکٹر کہا کہ "جہاں تک پی، ایچ، ڈی میں داخلہ کے استحقاق کا تعلق ہے اس میں کوئی شبہ نہیں کہ امیدوار اُس کا بہمہ وجوہ مستحق ہے، لیکن ایک بات کا خیال ضرور کرنا چاہیئے، اور وہ یہ کہ یہ نوجوان دو برس سے اپنی بیوی اور بچوں سے جُدا ہے، اب اگر یہ پی، ایچ، ڈی میں داخل ہو جاتا ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ وہ کم از کم دو برس اور اپنی بیوی بچّوں سے جُدا رہے گا، اور یہ بات نہ اس نوجوان کے حق میں اچھی ہے اور نہ اس کے متعلقین کے حق میں، اس لئے میری رائے یہ ہے کہ یا تو اس سے کہا جائے کہ تم ایک برس کے لئے گھر چلے جاؤ، اور پھر یہاں آکر داخلہ لے لو، اور اگر وہ اِسے نہ مانے تو اب دو صورتیں ہیں، ایک یہ کہ اس نوجوان کا اسکالرشپ بڑھا کر اتنا کر دیا جائے کہ وہ اپنی بیوی کو بھی یہاں بُلا لے اور بچّوں کو وطن میں نانا نانی کے پاس چھوڑ آئے، اور اگر بالفرض بیوی یہاں نہ آسکے تو اس نوجوان کو ہوائی جہاز سے ہندوستان جانے اور واپس آنے کا کرایہ دیا جائے تاکہ موسمِ گرما کی تعطیل وہ اپنے وطن میں گذار سکے، اسمتھ صاحب نے یہ فرمایا، اور بغیر کسی اختلاف کے اسی پر فیصلہ ہوگیا۔"

ممکن ہے آپ کے نزدیک یہ معمولی واقعہ ہو، لیکن حقیقت یہ ہے میرے دل پر اس کا غیر معمولی اثر ہوا اور یہ خیال کر کے آنکھوں میں آنسو بھر آئے کہ اللہ اکبر! ایک نو ہزار میل کی مسافت پر رہنے والے یہ اجنبی لوگ ہیں جو دلدہی اور دلجوئی کا اس درجہ خیال کرتے ہیں، اور دوسری طرف ہمارے برادرانِ وطن میں ہی ایسے لوگ موجود ہیں کہ ہمارے گھروں میں آگ لگتی اور ہم لُٹتے اور برباد ہوتے ہیں تو بجائے تسلی تشفّی کرنے کے جلی کٹی باتیں سُنا کر اور ہمارے زخموں پر نمک پاشی کرتے ہیں، "ببیں تفاوتِ رہ از کجاست تا بکجا" آہ! وہ یوسفِ کنعان جسے اُس کے بھائی کنوئیں میں جھونک آئیں اور ایک کاروان سرِ راہ اُسے عطیۂ قدرت سمجھ کر اُٹھالے۔

اور سنیئے، انسٹیٹوٹ کی ایک اسٹاف میٹنگ رمضان میں (۱۴ر فروری ۱۹۶۳ء کو)

© rasailojaraid.com

© rasailojaraid.com

ساڑھے تین بجے منعقد ہوئی یعنی غروب آفتاب سے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ پہلے اس طرح کی میٹنگس میں چائے کا انتظام ہوتا ہی ہے اور پھر یہ تو وقت بھی شام کا تھا، چنانچہ حسب معمول سوا چار بجے چائے آئی، لیکن چونکہ بار کر، حسینی اور میں، ہم تین آدمی روزہ سے تھے، اس لئے چائے کسی نے نہیں پی، یونہی رکھی رہی، آخر جب مغرب کا وقت ہوا اور ہم نے روزہ افطار کر لیا تو اب سب نے چائے مع اُس کے لوازم کے پی، اس پر مزید یہ ہوا کہ آپ کو معلوم ہی ہے یہاں ہر کام "دست خود دہانِ خود" کے مصداق ہوتا ہے، چنانچہ اس طرح کی میٹنگ کے بعد ہم ممبرانِ اسٹاف جن میں ڈائرکٹر اور اسسٹنٹ ڈائرکٹر سب ہی شامل تھے، چائے کی پیالیاں اور دوسرے برتن کچن (مطبخ و دارالطعام) میں اٹھا کر لے جاتے اور وہاں اُن کو دھو دھا تولیہ سے صاف صوف کر الماری میں قرینہ سے لگا کر رکھ دیتے تھے، اس میٹنگ میں چونکہ مسیحی ممبرانِ اسٹاف نے ہم تین مسلمانوں کی رعایت سے وقت پر چائے نہیں پی تھی، اس لئے میں نے بربنائے اظہارِ ممنونیت چائے کے برتن اُٹھانے میں سبقت کی، لیکن ڈاکٹر واٹسن جو وہاں لائبریرین اور بڑے درویش صفت انسان ہیں وہ اور دو تین اور پروفیسر میرے پیچھے لپکے اور کچن میں پہونچ کر سب برتن مجھ سے یہ کہہ کر چھین لئے کہ آپ کی نماز کو دیر ہو جائے گی، آپ نماز پڑھیے، برتن ہم دھو دیں گے۔

یونیورسٹی کے دائرہ میں اساتذہ اور طلباء کا جو اخلاق اور طور طریقِ زندگی ہوتا ہے، وہ درحقیقت پورے سماج کا آئینہ دار ہوتا ہے، یہ جو کچھ آپ نے سُنا صرف اربابِ جامعہ سے مخصوص نہیں ہے، بلکہ پوری قوم کا مزاج ہی کچھ ایسا بن گیا ہے، ہمارے برِصغیر انڈو پاک میں ہندو مسلمان اپنے اپنے تہوار مناتے اور خوب دعوت اور پارٹیاں کرتے ہیں، لیکن ہم میں کتنے ہیں جو غیر ملکی طلباء کو اس موقع پر اپنے ہاں مدعو کرتے ہوں، لیکن یہاں عام رواج ہے، کہ کرسمس کے موقع پر ہر فیملی حسب حیثیت دو چار غیر ملکی طلباء کو اپنے ہاں لنچ یا ڈنر پر اور اگر کچھ اور بھی نہیں تو کم از کم شام کی چائے پر مدعو کرتی ہے۔ اور اس طرح گویا تہوار کی خوشی اور اُس کے جشن میں اپنے ساتھ پردیسیوں کو بھی شریک کر لیتے ہیں، معیارِ زندگی اس قدر اونچا اور

© rasailojaraid.com